38

1۔جاوا کے ایک مخلص احمدی کی مخلصی کے لئے دعا کی جائے

2۔جماعت احمدیہ زیادہ سے زیادہ اپنے لڑکے قادیان بھیج کر تعلیم دلائے

3۔دہلی کا سفر اور اس کی غرض

(فرمودہ 18/ اکتوبر 1946ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"ہماری جماعت کو اللہ تعالیٰ نے مختلف جہات میں جو وسعت بخشی ہے وہ مختلف انواع اور درجات کی ہے۔ کہیں کم کہیں زیادہ، کہیں خاص طبقہ میں اور کہیں عَوَامُ النَّاس میں، کہیں صرف ہندوستانیوں میں اور کہیں غیر ملکی لوگوں میں۔ ان ممالک میں سے اہم ترین ممالک میں انڈونیشیا کا علاقہ بھی ہے یعنی سماٹرا اور جاوا کا علاقہ۔ سماٹرا اور جاوا میں کثرت کے ساتھ ہماری جماعت پائی جاتی ہے۔ کثرت سے یہ مراد نہیں کہ وہاں کے ملک کے لحاظ سے ہماری جماعت کو اکثریت حاصل ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہماری تبلیغی مساعی کے لحاظ سے وہاں کثرت سے جماعت پائی جاتی ہے۔ اِسی طرح دوسرے جزائر میں بھی کم و بیش تھوڑے تھوڑے احمدی پائے جاتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ سماٹرا اور جاوا کی جماعتوں کی تعداد اور دوسرے جزائر میں

جو تھوڑے بہت احمدی پائے جاتے ہیں ان سب کو اگر ملا لیا جائے تو ہمارا پندرہ ہزار آدمی ان علاقوں میں ہو گا۔ ساڑھے سات کروڑ کی آبادی میں پندرہ ہزار کی نسبت کچھ بھی چیز نہیں۔ لیکن اِس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ ہماری جد و جہد ابھی معمولی ہے یہ تعداد بھی بہت خوشکن اور امید افزا ہے۔ در حقیقت ساڑھے سات کروڑ آدمی جو ہزار ہا جزائر میں پھیلے ہوئے ہیں اُن کے لئے مبلغ بھی ہزاروں چاہئیں۔ بلکہ ہزاروں کا بھی سوال نہیں ہمیں ان جزائر میں تبلیغ کرنے کے لئے لاکھوں مبلغین کی ضرورت ہے اور لاکھوں مبلغوں کے بعد ہم عظیم الشان نتائج کی امید کر سکتے ہیں۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ اِس وقت تک ہماری طرف سے وہاں صرف چھ سات مبلغ گئے ہیں اور چھ سات مبلغوں کی کوشش سے اِتنی بڑی تعداد کا شامل ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ اِس دَور انقلابی میں جو وہاں پیدا ہؤا کہ پہلے سماٹرا اور جاوا پر جاپان نے قبضہ کر لیا۔ پھر انڈونیشین کی خود مختار حکومت قائم ہوئی۔ پھر انگریزوں نے ڈچ کو داخل کرنے کی کوشش کی اور اب وہاں ری پبلکن حکومت قائم ہے۔ بہت سے ابتلا بھی ہماری جماعت پر آئے اور جاپانی قبضہ کے زمانہ میں احمدیوں کے ساتھ سختی بھی کی گئی۔ پہلے تو اس طرف توجہ نہیں کی گئی تھی لیکن آہستہ آہستہ جب جاپانیوں کا ڈر دور ہؤا اور اُن کے پاس شکایتیں پہنچنے لگیں تو احمدیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ لیکن جب وہ اپنے ارادوں کو جماعت احمدیہ کے خلاف پوری مضبوطی سے قائم کر چکے تو یکدم اللہ تعالیٰ نے ان کی حکومت کو تباہ کر دیا اور انڈونیشیا میں ری پبلکن حکومت قائم ہو گئی۔ اِس ری پبلکن حکومت کے زمانہ میں اور اِس سے پہلے زمانہ میں بھی جب کہ افراد محض انفرادی طور پر اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے کوشش کرتے تھے ہماری جماعت نے ری پبلکن تحریک کا ساتھ دیا تھا اور ملک کی آزادی کے لئے اس نے ہر رنگ میں کوشش کی تھی۔ اِسی لئے جاپانی حکومت کے جانے کے بعد جب ری پبلکن حکومت قائم ہوئی تو عام طور پر ہماری جماعت کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ افسروں کا رویہ ہماری جماعت کے ساتھ بہت بہتر رہا اور اُنہوں نے ہم سے اپنے تعلقات قائم رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ جاوا میں اب بھی ہمارے مبلغین کام کر رہے ہیں۔ گو اُنہیں آہستگی سے کام کرنا پڑتا ہے لیکن بہر حال اُن کے کام میں کوئی خاص روک نہیں پائی جاتی۔ اور جیسا کہ ان کے خطوط سے

معلوم ہوتا ہے بعض اعلیٰ حکام حتّٰی کہ بعض وزراء تک بھی ہمارے مبلغوں سے ملتے ہیں، اُن سے مشورہ بھی کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ہندوستان پیغام بھی بھجواتے ہیں۔ وہاں ہماری جماعت کے ایک معزز دوست مولوی محی الدین صاحب ہیں جو ہمارے مبلغ مولوی عزیز احمد صاحب کے خسر ہیں۔ مولوی عزیز احمد صاحب کنجاہ ضلع گجرات کے رہنے والے ہیں اور وہ تحریک جدید کے ماتحت اس ملک میں تبلیغِ اسلام کے لئے بھجوائے گئے تھے۔ انہوں نے وہاں مولوی محی الدین صاحب کی لڑکی سے شادی کر لی۔ مولوی محی الدین صاحب وہاں ہماری جماعت میں بہت اعزاز رکھتے ہیں اور ری پبلکن حکام میں بھی ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر اب مولوی رحمت علی صاحب اور بعض دوسرے دوستوں کی چِٹھیوں سے معلوم ہوا ہے کہ رات کو چھاپہ مار کر کوئی اُن کو قید کر کے لے گیا ہے۔ ابھی تک یہ پتہ نہیں لگ سکا کہ ان کو کون قید کر کے لے گیا ہے۔ ایک ماہ بلکہ ڈیڑھ ماہ کے قریب عرصہ ہو گیا ہے ابھی تک ان کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو کس نے پکڑا ہے۔ وہاں اس وقت چار قسم کی جماعتوں کا زور ہے۔ اول ڈچ حکومت جو بعض ساحلی شہروں پر ہے۔ دوسرے بعض ساحلی شہروں پر برطانوی حکومت ہے جو جاپانی قیدیوں کا انتظام کرنے کے نام سے قائم ہے۔ پھر ایک ری پبلکن حکومت ہے یعنی جاوا اور سماٹرا کے اصل باشندوں کی حکومت۔ وہ آگے دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک کمیونسٹ پارٹی ہے جس نے الگ انتظام کر رکھا ہے۔ یہ پارٹی ایک دفعہ ڈاکٹر شہریار وزیر اعظم کو بھی پکڑ کر لے گئی تھی۔ دوسری انڈونیشین حکومت ہے جس کے پریذیڈنٹ ڈاکٹر سکارنو (Soekarno) اور وزیر اعظم مسٹر شہریار ہیں۔ انہی چاروں میں سے کسی ایک کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ انہیں پکڑ کر لے گئی ہو۔ لیکن جہاں تک انسانی عقل کام کرتی ہے ری پبلکن حکومت کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ انہیں گرفتار کر کے لے گئی ہو کیونکہ ہماری جماعت ری پبلکن حکومت کے ساتھ کام کرتی رہی ہے اور اس زمانہ سے کام کرتی رہی ہے جب انڈونیشیا پر جاپان کا قبضہ تھا۔ مولوی محی الدین صاحب کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ چونکہ گزشتہ ڈچ حکومت کے زمانہ میں وہ ایک ذمہ دار عُہدہ پر فائز تھے، ڈچ حکومت نے ان کو بہت لالچیں دیں اور کہا کہ پھر ہماری ملازمت میں آ جاؤ۔ مگر

انہوں نے ڈچ حکومت کی ملازمت سے انکار کر دیا اور کہا کہ مَیں اپنے ملک کی خدمت کر رہا ہوں مَیں تم میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہی شبہ ہو سکتا ہے کہ ڈچ حکومت نے انہیں قید کر دیا ہو۔ اگر ایسا ہے تو خطرہ ہے کہ اُن کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ آج ہی ایک دوست نے بتایا کہ انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ اندرون ملک چلے جائیں اور وہاں نہ رہیں جہاں ڈچ حکومت ہے۔ لیکن ری پبلکن حکومت نے اُن کو مشورہ دیا کہ ابھی آپ نہ جائیں اور یہیں کام کرتے رہیں۔ اِس لئے غالب گمان یہی ہے کہ ڈچ حکومت نے ان کو پکڑ لیا ہے۔ بہر حال وہاں کی جماعت کو صدمہ ہے اور وہ بار بار خطوط لکھ رہے ہیں کہ مولوی محی الدین صاحب کے متعلق دعا کی جائے کیونکہ وہ جماعت کے بہت با اثر آدمی ہیں اور نہایت مفید کام کرنے والے وجود ہیں۔ زیادہ صدمہ کی بات یہ ہے کہ ان کی لڑکی یعنی مولوی عزیز احمد صاحب کی بیوی اس صدمہ میں پاگل ہوگئی ہے۔ یوں تو سب لوگ مرتے ہیں لیکن یہ خیال کہ نہ معلوم دشمن کی طرف سے میرے باپ کو کیا کیا تکالیف پہنچائی جارہی ہوں گی اس نے ان کی لڑکی پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ مَیں دوستوں کو تحریک کرتا ہوں کہ وہ اپنی دعاؤں میں خاص طور پر مولوی محی الدین صاحب کو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں حفاظت سے رکھے، خیریت سے واپس لائے اور جماعت کی خدمت کا انہیں مزید موقع عطا فرمائے اوران کی لڑکی کو بھی صحت دے۔ نہ صرف خود اس لڑکی کے خیال سے بلکہ اس خیال سے بھی کہ ہمارا مبلغ زیادہ سہولت اور دلجمعی سے کام کر سکے۔

2۔جماعت احمدیہ زیادہ سے زیادہ اپنے لڑکے قادیان بھیج کر تعلیم دلائے: اِسی سلسلہ میں مَیں جماعت کو اِس امر کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اب خدا تعالیٰ کے فضل سے جس رنگ میں ہماری جماعت پھیل رہی ہے وہ ایک غیر معمولی امر ہے۔ بظاہر ایک ایک اور دو دو آدمی ہماری جماعت میں شامل ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ ایک ایک اور دو دو اس طرح داخل ہو رہے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص منشاء ان کے پس پردہ کام کر رہا ہے۔ ایک جزیرہ کے متعلق اطلاع پہنچی ہے ☆ کہ وہاں کا راجہ احمدیت میں داخل ہو گیا ہے۔ جزیرہ بہت چھوٹا سا ہے لیکن بہر حال اس جزیرہ کا راجہ احمدی ہو چکا ہے اور اس کے ذریعہ سے اس کا باقی خاندان بھی

☆ مجھے یاد نہیں کہ مَیں نے اس کا پہلے بھی ذکر کیا ہے یا نہیں۔

احمدی ہو گیا ہے۔ اب وہ ہم سے مبلغ مانگ رہے ہیں تا کہ جزیرہ کی باقی آبادی میں بھی جو دس ہزار کے قریب ہے احمدیت پھیلائی جا سکے۔ اِسی طرح پرسوں اترسوں ایک اٹالین جو دورانِ جنگ میں بطور جنگی قیدی ہندوستان لائے گئے تھے احمدی ہوئے ہیں اور گو اٹلی میں ہمارے پہلے بھی احمدی دوست موجود ہیں لیکن یہ اٹالین نوجوان اٹلی کے سب سے پہلے احمدی ہوں گے جو دوسروں سے یہ کہہ سکیں گے کہ مَیں نے خود قادیان کو دیکھا اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اِسی طرح انگلستان سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ ایک جرمن قیدی جو برطانیہ میں تھا اس نے خط و کتابت کے ذریعے ہمارے مشن سے سلسلہ کے حالات معلوم کئے اور اسلام لے آیا۔ یہ حالات بتاتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر جگہ احمدیت کا بیج بویا جا رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ بیج نشو و نما حاصل کر کے بہت بڑی شاندار صورت اختیار کر لے۔ اِسی طرح مَیں پہلے اعلان کر چکا ہوں کہ ایک روسی جو بھاگ کر سپین آ گیا تھا اور جو ایک معزز خاندان کا فرد ہے وہ احمدی ہو چکا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ جب بھی اسے موقع ملا وہ خط و کتابت کے ذریعے سے اور بعض دوسرے ذرائع سے اپنے ملک میں تبلیغ کرے گا۔ تبلیغ کے یہ نئے نئے رستے جو مختلف ممالک میں کُھل رہے ہیں ہماری جماعت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد کرتے ہیں۔ یہ لازمی بات ہے کہ جب تبلیغ پھیلے گی تو ہمیں زیادہ سے زیادہ مبلغوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ گزشتہ دنوں ہم نے اپنے سارے مبلغوں کے کھاتے پورے کئے اور ہم نے یہ سمجھ لیا کہ اب چھ ماہ یا سال تک ہمیں مزید مبلغوں اور کارکنوں کی ضرورت نہیں ہو گی لیکن حالات جس سُرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں جلد ہی مزید گریجوایٹوں اور مولوی فاضلوں کی ضرورت پیش آنے والی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دو تین سال تک متواتر ہر سال ہمیں پچاس پچاس، سو سو آدمیوں کی ضرورت ہو گی۔ اس کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ ہر جگہ سے ہمیں مطالبہ پر مطالبہ آ رہا ہے کہ اَور مبلغ بھیجو اَور مبلغ بھیجو۔ اور ہر جگہ خدا تعالیٰ کے فضل سے تبلیغ کے نئے سے نئے رستے کُھل رہے ہیں۔ بے شک بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں موجودہ حالات میں ہمارے لئے تبلیغ کرنا ناممکن ہے اور حکومتوں کی طرف سے اس میں روک ڈالی جاتی ہے مگر ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ جب

کام کرنے والے آدمی ہوں تو وہ اپنے کام کے لئے خود ہی راستے نکال لیا کرتے ہیں۔ قانون اَور چیزوں میں روک بن جاتا ہے لیکن تبلیغ میں روک نہیں بن سکتا۔ آخر مکہ والے بھی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تبلیغ نہیں کرنے دیتے تھے مگر کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اِس بات کی پروا کی؟ پس جب بھی ہمارے پاس کافی مبلغ ہوئے ایسے ممالک میں بھی ہمارے مبلغوں کو جانا پڑے گا۔ اس وقت پانچ چھ ممالک ایسے ہیں جہاں قانونی طور پر مبلغین کو جانے نہیں دیا جاتا۔ اس وقت ہم خاموش ہیں اور اس بارہ میں کوئی جدوجہد کرنا اپنی طاقت کا ضیاع سمجھتے ہیں کیونکہ ابھی کئی ممالک جن میں ہمارے مبلغ جاسکتے ہیں خالی پڑے ہیں اور وہ ہم سے مبلغین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان ممالک کی موجودگی میں ان ممالک میں زبردستی جا کر تبلیغ کرنا جو اپنے ملکوں میں آنے کی اجازت نہیں دیتے اپنی طاقت کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب آزاد ممالک ہمارے مبلغین سے بھر جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ ان ممالک کی طرف توجہ کریں جن میں قانونی طور پر اسلامی مبلغین کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اس وقت ہمارا فرض ہوگا کہ ہم زبردستی ان ممالک میں جائیں اور پھر چاہے قید ہوں یا مارے جائیں، برابر تبلیغِ احمدیت کا جھنڈا بلند کرتے چلے جائیں۔ پس ہماری جماعت کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ واقفین پیدا کرنے چاہئیں اور واقفین اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک زیادہ سے زیادہ تعلیم ہماری جماعت میں رائج نہ ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جماعت کی تعلیمی ترقی کے لئے اس سال کالج میں جو بی۔اے، بی۔ایس۔سی کی جماعتیں کھولی گئی تھیں اُن میں اب تک صرف بائیس لڑکے داخل ہوئے ہیں☆ حالانکہ کالجوں میں عام طور پر چالیس پینتالیس فیصدی طالب علم پاس ہوتے ہیں۔ اگر اس سے بھی زیادہ اچھا نتیجہ نکلے تو بھی اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہمارے بی۔اے، بی۔ایس۔سی میں صرف دس گیارہ لڑکے پاس ہوں گے اور دس گیارہ لڑکوں میں سے تبلیغ کے لئے انتخاب کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ انتخاب کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ لڑکوں کی تعداد زیادہ ہو کیونکہ کچھ ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، کچھ تجارت کی طرف چلے جاتے ہیں، کچھ کام کے نااہل ہوتے ہیں

☆ اس کے بعد تعداد بڑھ کر ستائیس تک پہنچ گئی ہے۔

اور اس طرح قلیل تعداد ایسے لڑکوں کی نکلتی ہے جو تبلیغ کے لئے انتخاب میں آنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ پس اگر ہمیں دس گیارہ لڑکے ہی ملیں تو ان دس گیارہ میں سے ہم انتخاب کس طرح کر سکتے ہیں۔ مبلغین کا انتخاب تم اس وقت تک کامیاب طور پر نہیں کر سکتے جب تک ہر سال ڈیڑھ دو سو طالب علم بی۔ اے کے امتحان میں پاس نہ ہوں۔ کیونکہ امتحان پاس کرنے کے بعد جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے کچھ تجارتیں شروع کر دیتے ہیں، کچھ ملازمتیں اختیار کر لیتے ہیں، کچھ اَور کاروبار کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جو باقی رہ جائیں وہ ہمارے کام آسکتے ہیں۔ اِسی طرح جب تک ہر سال ہمیں سو ڈیڑھ سو مولوی فاضل نہ ملیں ہم اپنے کام کو صحیح طور پر سر انجام نہیں دے سکتے۔ ہمیں اپنے گزشتہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ تبلیغ کے لئے فوری طور پر گریجوایٹ زیادہ مفید ہوتے ہیں کیونکہ گریجوایٹ ہونے کی وجہ سے وہ غیر زبان زیادہ آسانی سے سیکھ جاتے ہیں اور پھر بوجہ انگریزی زبان جاننے کے وہ ہر ملک میں کام کر سکتے ہیں کیونکہ انگریزی زبان جس سے انہیں واقفیت ہوتی ہے اس کے بولنے اور سمجھنے والے تمام ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ نقص ہے کہ گریجوایٹ دینی تعلیم جلد حاصل نہیں کر سکتے اِس لئے ہمارا بہترین تجربہ یہ ہے کہ تبلیغ کے لئے ایک مولوی فاضل اور ایک گریجوایٹ دونوں کو اکٹھا بھیجا جائے۔ مولوی فاضل انسائیکلوپیڈیا کا کام دیتا ہے اور جن مسائل سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بتاتا چلا جاتا ہے اور زبان دانی کے لحاظ سے گریجوایٹ زیادہ مفید کام کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ آخر اکٹھے رہنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ گریجوایٹ مولوی فاضل کی طرح دینی مسائل سے واقف ہو جاتا ہے اور مولوی فاضل گریجوایٹ کی طرح غیر زبانیں سیکھ جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ سلسلہ جاری رہا تو چند سالوں میں ہی ہماری جماعت میں ایسے علماء پیدا ہو جائیں گے جو فرانسیسی زبان بھی جانتے ہوں گے، جرمن زبان بھی جانتے ہوں گے، اٹالین زبان بھی جانتے ہوں گے، سپینش زبان بھی جانتے ہوں گے اور اسی طرح دوسری زبانیں جانتے ہوں گے۔ وہ دوسرے مسلمانوں کے علماء کی طرح نہیں ہوں گے بلکہ مختلف زبانوں میں مہارت رکھنے والے ہوں گے۔ اور اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو لوگ مولوی ہوں انہیں کوئی دوسری زبان آتی ہی نہیں بلکہ آ ہی نہیں سکتی۔ مگر یہ ایسے لوگ

ہوں گے جو اعلیٰ درجہ کے عالم ہونے کے باوجود فرانسیسی میں بھی تقریر کر سکیں گے، جرمن میں بھی تقریر کر سکیں گے، اٹالین میں بھی تقریر کر سکیں گے، سپینش میں بھی تقریر کر سکیں گے۔ ڈچ میں بھی تقریر کر سکیں گے۔ ہر شخص حیرت سے انہیں دیکھے گا اور کہے گا مولوی اور فرانسیسی میں تقریر، مولوی اور جرمن میں تقریر، مولوی اور اٹالین میں تقریر، مولوی اور سپینش میں تقریر، مولوی اور ڈچ میں تقریر، مولوی اور دوسری زبانوں میں تقریر۔ غرض ان کے لئے یہ ایک عجوبہ چیز ہو گی اور خدا تعالیٰ کے فضل سے یہ عجوبہ ہر جگہ اثر کئے بغیر نہیں رہے گا۔ کیونکہ ہمارے مولوی صرف مولوی نہیں ہوں گے بلکہ ناظم بھی ہوں گے اور ان کو ان باتوں کا بھی علم ہو گا جن کا ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کو ہوتا ہے۔ ابھی افریقہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے جو کمیشن بھیجا گیا تھا دہلی واپس آیا تو اس کمیشن کے مسلمان ممبر صاحب خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور انہوں نے کہا کہ مَیں آپ سے اس لئے ملنے آیا ہوں کہ آپ کے مشرقی افریقہ کے مبلغ مولوی مبارک احمد صاحب سے ہمیں بہت مدد ملی ہے اور وہ سب معاملات کو نہایت اچھے طور پر جانتے ہیں۔ وہ صرف مولوی ہی نہیں بلکہ تمام قسم کے معاملات کو سمجھتے اور بڑی عمدگی سے اپنے فرض کو سرانجام دیتے ہیں۔ اس رنگ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے ہماری لیاقت کا معیار روز بروز بڑھتا چلا جائے گا اور ہمارے علماء پرانے علماء کی طرح کنویں کے مینڈک نہیں ہوں گے بلکہ وہ سمندر کے جہاز کی طرح ہوں گے جو دنیا کے ہر گوشہ میں جاتا اور مضبوطی کے ساتھ ہر طوفان کا مقابلہ کرتا ہے۔ مگر یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب زیادہ سے زیادہ تعلیم کا رواج ہماری جماعت میں ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ جن کے بیٹے یہاں بی۔ اے میں پڑھ سکتے تھے انہوں نے معمولی معمولی عذرات کی بناء پر ان کو باہر کے کالجوں میں داخل کرا دیا ہے بلکہ دو کے متعلق تو مجھے شبہ ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ انہوں نے پہلے اپنے کالج کے پرنسپل سے مجھے لکھوایا کہ یہاں کالج میں مسلمان لڑکوں کا ہونا نہایت ضروری ہے آپ اجازت دیں کہ ان لڑکوں کو یہاں داخل کر لیا جائے۔ انہوں نے سمجھا کہ مَیں اِس طرح سے اجازت دے دوں گا اور وہ بعد میں بڑے دعویٰ سے کہہ سکیں گے کہ ہمارا تو یہی ارادہ تھا کہ ہم اپنے لڑکوں کو قادیان میں داخل کرائیں مگر آپ کے

حکم سے ہم ان کو باہر داخل کرنے پر مجبور ہوئے۔ مگر جب سلسلہ کی طرف سے لکھا گیا کہ ان لڑکوں کو باہر کے کسی کالج میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تو اس کے بعد بھی غالب خیال یہی ہے کہ ان لڑکوں کو باہر کے کالج میں داخل کرا دیا گیا ہے کیونکہ وہ لڑکے اب تک یہاں کالج میں داخل نہیں ہوئے۔ گویا مجھ سے جو کچھ پوچھا گیا تھا وہ محض مجھے دھوکا دینے کے لئے تھا۔ دیانتداری پر مبنی نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے چالا کی کرنی چاہی تھی مگر مَیں نہیں پکڑا گیا بلکہ وہ خود پکڑے گئے۔ ایسے واقعات نہایت افسوسناک ہیں۔ کاش! میرا یہ شبہ غلط نکلے اور اس کے بعد وہ لڑکے قادیان میں داخل ہو گئے ہوں۔ ہماری جماعت کا فرض ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے لڑکے قادیان بھجوا کر انہیں تعلیم دلوائے۔ سرِ دست ہمارا ہر سال پندرہ سو لڑکا انٹرنس (Entrance) کی جماعتوں میں جانا چاہئے اور کم سے کم پانچ سات سو لڑکا کالجوں میں جانا چاہئے۔ اس وقت مسلمانوں میں ہر سال چار سو کے قریب گریجوایٹ نکلتے ہیں۔ اگر ہم صحیح طور پر کوشش کریں تو چار سو گریجوایٹ سالانہ ہم اپنی جماعت میں سے پیدا کر سکتے ہیں اور اِس طرح علمی لحاظ سے ان پر بہت بڑا تفوّق حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر علمی تفوّق کو جانے دو تب بھی ہماری مذہبی ضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ہم اپنی جماعت میں زیادہ سے زیادہ تعلیم رائج کریں۔ اگر ہم میں تعلیم نہیں ہو گی تو ہم اتنے مبلغ پیدا نہیں کر سکیں گے جتنے مبلغوں کی ہمیں ضرورت ہے۔ اِس وقت ہمیں ہزاروں مبلغ چاہئیں لیکن اس ضرورت کے مقابلہ میں ہمارا تعلیمی معیار بہت کم ہے بلکہ جو تعلیم کا معیار اس وقت دوسری قوموں میں پایا جاتا ہے وہ بھی ہمارے لئے کافی نہیں۔ اگر وہی معیار ہمارے اندر آ جائے تو ہم ہزاروں نہیں سینکڑوں نہیں درجنوں مبلغ بھی ہر سال پیدا نہیں کر سکتے۔ پس ہمیں اپنے معیار کو بلند کرنا ہو گا۔ نہ صرف بلند بلکہ بہت زیادہ بلند۔ قوموں کے مقابلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے جس قدر زیادہ سے زیادہ تعلیم ایک انسان کے لئے ضروری ہو سکتی ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی جماعت کے ہر فرد میں وہ تعلیم رائج کریں تب ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔

3۔ دہلی کا سفر اور اس کی غرض: اس کے بعد مَیں اس سوال کی طرف آتا ہوں جس کے متعلق بہت سے دوستوں کے دلوں میں مختلف قسم کے سوالات اور گُدگُدیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

اور بعض نے لکھا ہے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں لگا کہ گزشتہ دنوں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ یعنی دہلی کا سفر اور اس کی غرض۔

مَیں نے دہلی کا سفر کیوں کیا؟ اس کی وجہ در حقیقت وہ خوابیں تھیں جو "الفضل" میں چھپ چکی ہیں۔ ان خوابوں سے مجھے معلوم ہؤا کہ اس مسئلہ کے حل کو اللہ تعالیٰ نے کچھ میرے ساتھ بھی وابستہ کیا ہؤا ہے۔ تب مَیں نے اس خیال سے کہ جب میرے ساتھ بھی اس کا کچھ تعلق ہے تو مجھے سوچنا چاہیئے کہ مَیں کس رنگ میں کام کر سکتا ہوں۔ اِس مسئلہ پر غور کیا اور مَیں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ممکن ہے برطانوی حکومت اس غلطی میں مبتلا ہو کہ اگر مسلم لیگ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو مسلمان قوم بحیثیت مجموعی ہمارے خلاف نہیں ہو گی بلکہ ایسے مسلمان جو لیگ میں شامل نہیں اور ایسی جماعتیں جو لیگ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتیں اُن کو ملا کر وہ ایک منظّم حکومت ہندوستان میں قائم کر سکے گی۔ اس خیال کے آنے پر مَیں نے مزید سوچا اور فیصلہ کیا کہ ایسے لوگ جو لیگ میں شامل نہیں یا ایسے لوگ جنہیں تعصب کی وجہ سے لیگ والے اپنے اندر شامل کرنا پسند نہیں کرتے۔ جیسے احمدی کہ ان کو تعصب کی وجہ سے لیگ میں شامل کرنا پسند نہیں کیا جاتا اِن دونوں قسم کے لوگوں کو چاہیئے کہ آپس میں مل جائیں اور مل کر گورنمنٹ پر یہ واضح کر دیں کہ خواہ ہم لیگ میں نہیں لیکن اگر لیگ کے ساتھ حکومت کا ٹکراؤ ہؤا تو ہم اس کو مسلمان قوم کے ساتھ ٹکراؤ سمجھیں گے اور جو جنگ ہو گی اس میں ہم بھی لیگ کے ساتھ شامل ہوں گے۔ یہ سوچ کر مَیں نے چاہا کہ ایسے لوگ جو اثر رکھنے والے ہوں خواہ اپنی ذاتی حیثیت کی وجہ سے اور خواہ قومی حیثیت کی وجہ سے ان کو جمع کیا جائے۔ دوسرے مَیں نے مناسب سمجھا کہ کانگرس پر بھی اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ وہ اس غلطی میں مبتلا نہ رہے کہ مسلمانوں کو پھاڑ پھاڑ کر وہ ہندوستان پر حکومت کر سکے گی۔ اسی طرح نیشنلسٹ خیالات رکھنے والوں پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ کانگرس کے ایسے حصوں کو سنبھال کر رکھیں اور ان کے جوشوں کو دبائیں۔ جن کا یہ خیال ہو کہ وہ مسلمانوں کو دبا کر یا ان کو آپس میں پھاڑ پھاڑ کر حکومت کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر مَیں نے ایک تار نواب صاحب چھتاری کو دیا۔ وہ بھی لیگ میں شامل نہیں لیکن مسلمانوں میں بہت رسوخ رکھنے والے آدمی ہیں، یو۔پی کے گورنر رہ چکے ہیں

اور اب حکومتِ آصفیہ کے وزیر اعظم کے عُہدہ سے واپس آئے ہیں۔ اس تار کا جواب آنے پر مَیں نے انہیں لکھا کہ میرا اب ایسا ایسا ارادہ ہے کیا آپ اس میں شریک ہو سکتے ہیں؟ دوسرا تار مَیں نے کانگرس سے میل جول کے لئے مسز نائیڈو کو دیا۔ مسز نائیڈو میری پرانی واقف ہیں اور وہ ہمیشہ کہا کرتی ہیں کہ میرے دل میں مسلمانوں کا بہت درد ہے اور مَیں ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ مگر افسوس کہ انہوں نے تار کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر دوبارہ تار دیا گیا تو اس کا بھی جواب نہ دیا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ وہ اس تحریک میں شامل ہونا پسند نہیں کرتیں۔ جب یہ باتیں ہو چکیں تو مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے جلدی قادیان پہنچنا چاہئے اور اس سکیم کے متعلق مزید کارروائی کرنی چاہئے۔ یہاں پہنچ کر جب مَیں نے غور کیا تو میرے دل میں تحریک پیدا ہوئی کہ خواب میں مَیں نے دیکھا ہے کہ صلح اور سمجھوتہ کرانے کے لئے مَیں بیچ میں ہوں۔ بیچ میں ہونے کے یہی معنے نہیں ہوتے کہ ضرور کوئی شخص بیچ میں ہو بلکہ یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ اس کا ان باتوں سے کوئی اشتراک اور تعلق ہے۔ اس پر مَیں نے سوچا کہ چونکہ دلّی میں فیصلے ہو رہے ہیں مجھے بھی دلّی چلنا چاہئے۔ دوسرا فائدہ اس کا یہ بھی ہو گا کہ دلّی میں ہمیں تازہ بتازہ خبریں ملتی رہیں گی اور اگر حالات بگڑتے معلوم ہوئے تو ہم فوراً دعا کر سکیں گے۔ قادیان میں تو ممکن ہے ہمیں ایسے وقت میں خبر ملے جب واقعات گزر چکے ہوں اور دعا کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ کیونکہ دعا ماضی کے لئے نہیں ہوتی مستقبل کے لئے ہوتی ہے۔ نیز مجھے یہ بھی خیال آیا کہ بعض اَور بارسوخ لوگوں کو بھی اس تحریک میں شامل کرنا چاہئے جیسے سر آغا خاں ہیں۔ گو سر آغا خاں ہندوستان میں نہیں تھے مگر مَیں نے سمجھا کہ چونکہ ان کی جماعت بھی مسلمان کہلاتی ہے اگر ان کو بھی شریک ہونے کا موقع مل جائے تو گورنمنٹ پر یہ امر واضح ہو جائے گا کہ مسلمانوں کی ایک اَور جماعت بھی ایسی ہے جو اِس بارہ میں مسلم لیگ کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہے۔ چنانچہ لنڈن مشنری کی معرفت مَیں نے سر آغا خاں کو بھی تار بھجوا دیا۔ اس دوران میں مَیں نے قادیان سے اپنے بعض نمائندے اس غرض کے لئے بھجوائے کہ وہ نواب صاحب چھتاری سے تفصیلی گفتگو کر لیں اور انہیں ہدایت کی کہ وہ لیگ کے نمائندوں سے بھی ملیں اور ان پر یہ امر واضح کر دیں کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ لیگ کے

مقاصد کے خلاف کوئی کام کریں۔ اگر یہ تحریک لیگ کے مخالف ہو تو ہمیں بتا دیا جائے ہم اِس کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اگر مخالف نہ ہو تو ہم کام شروع کر دیں۔ اس پر لیگ کے بعض نمائندوں نے تسلیم کیا کہ یہ تحریک ہمارے لئے مفید ہو گی، بالکل باموقع ہو گی اور ہم یہ سمجھیں گے کہ اس ذریعہ سے ہماری مدد کی گئی ہے ہمارے رستہ میں روڑے نہیں اٹکائے گئے۔ چنانچہ مَیں دلّی پہنچ گیا۔ وہاں جو کچھ کام ہوا اُس کی تفصیلات میں مَیں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ میرا خیال ہے کہ مَیں ایک کتاب "سفر دہلی" پر لکھوں کیونکہ بہت سی باتیں ہیں جو اِس سفر کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے آئندہ کام کے رستے کھولنے والی ہیں۔ سرِ دست میں صرف اس قدر ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جب مَیں دلّی گیا تو سر آغا خاں کی طرف سے بھی جواب آ گیا اور وہاں بعض اَور لیڈروں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ جیسے سر سلطان احمد ہیں۔ مسلمانوں میں سے صرف ایک صاحب نے جواب نہیں دیا حالانکہ ان کو دو دفعہ تار دیا گیا تھا اور وہ سر محمد عثمان ہیں۔ ان کے چودھری ظفر اللہ خان صاحب کے ساتھ تعلقات ہیں اور مجھ سے ملنے کا بھی موقع ہوا ہے۔ ممکن ہے وہ اس وہم میں مبتلا رہے ہوں کہ ہمارا کام کہیں لیگ کے لئے مُضِر نہ ہو۔ لیکن ہم نے لیگ کے نمائندوں سے پہلے مشورہ کر لیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر ہماری یہ کوششیں ان کے نزدیک مُضِر ہوں تو ہم ان کو ترک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ بہرحال جیسا کہ ظاہر ہے ہم نہ لیگ میں شامل تھے نہ کانگرس میں، نہ لیگ نے ہمیں اپنا نمائندہ بنایا تھا نہ کانگرس نے۔ اس لئے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ انہی کی طرح باقاعدہ ہم بھی مشورہ کی مجالس میں شامل ہوتے۔ ہماری جماعت کے بعض ناواقف دوستوں نے لکھا ہے کہ وائسرائے پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر جناح کے مشوروں کا ذکر تو اخباروں میں آتا ہے آپ کا کیوں نہیں آتا۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ وہ تو اُن سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہیں جنہوں نے باہمی فیصلہ کرنا تھا اور ہم کسی سیاسی جماعت کے نمائندہ نہیں تھے بلکہ ہم اپنا اثر ڈال کر اُنہیں نیک راہ بتانے کے لئے گئے تھے۔ سیاسی جماعتوں کی نمائندگی نہ ہمارا کام تھا اور نہ گورنمنٹ یا کوئی اَور اِس رنگ میں ہمیں بُلا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ ہم سے مشورہ لے اور ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھے۔ ہماری جماعت ہندوستان میں سات آٹھ لاکھ

کے قریب ہے مگر ہماری جماعت کے افراد اِس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کی آواز کی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی۔ لیگ ہمیں اپنے اندر شامل نہیں کرتی اور کانگرس میں ہم شامل نہیں ہونا چاہتے۔ اِس کے مقابلہ میں پارسی ہندوستان میں تین لاکھ کے قریب ہیں۔ لیکن حکومت کی طرف سے ایک پارسی وزیر سنٹر میں مقرر کر دیا گیا ہے اور ان کی جماعت کو قانونی جماعت تسلیم کر لیا گیا ہے حالانکہ ہماری جماعت اُن سے دُگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ مَیں نے دہلی میں ایک انگریز افسر کو کہلا بھیجا کہ ہم شکوہ نہیں کرتے لیکن حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے وہ نہایت غیر منصفانہ ہے۔ انہوں نے پارسیوں کا قانونی وجود تسلیم کیا مگر احمدیوں کا نہیں حالانکہ تم ایک ایک پارسی لاؤ مَیں اس کے مقابلہ میں دو دو احمدی پیش کرتا چلا جاؤں گا۔ صرف اس لئے کہ ہماری جماعت بولتی نہیں اور ہماری جماعت دوسروں کی طرح لڑتی نہیں، ہمارے حقوق کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس نے کہا ہم آپ کی جماعت کو ایک مذہبی جماعت سمجھتے ہیں۔ میرے نمائندہ نے اس کو جواب دیا کہ بے شک ہم ایک مذہبی جماعت ہیں مگر کیا ہم نے ہندوستان میں رہنا ہے یا نہیں؟ اور کیا ہندوستان کی سیاسیات کا اثر ہم پر نہیں پڑتا؟ (دوسرا جواب اِس کا یہ ہے کہ کیا پارسی مذہبی جماعت نہیں اور عیسائی مذہبی جماعت نہیں۔ ان کے آدمی پارسی اور عیسائی کر کے لئے گئے ہیں یا کسی سیاسی جماعت کے نمائندے کر کے؟) بہر حال یہ تو ایک ضمنی بات تھی جو کوشش صلح کے لئے ہو سکتی تھی وہ مَیں نے کی اور اسی سلسلہ میں مَیں مسٹر گاندھی سے بھی ملا۔ میرا منشاء تھا کہ مَیں ان سے تفصیل سے بات کروں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ آپس کا تفرقہ ٹھیک نہیں۔ ان کو کوشش کرنی چاہئے کہ کچھ وہ چھوڑ دیں اور کچھ لیگ چھوڑ دے تاکہ ملک کی بدامنی خطرناک رنگ اختیار نہ کر لے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ لڑتے آپ ہیں لیکن آپ لوگوں کی جان پر اِس کا وبال نہیں بلکہ اُن ہزاروں ہزار لوگوں پر ہے جو قصبوں میں رہتے ہیں یا دیہات میں رہتے ہیں اور تہذیب اور شائستگی کو نہیں سمجھتے۔ وہ ایک دوسرے کو ماریں گے، ایک دوسرے کو لُوٹیں گے اور ایک دوسرے کے گھروں کو جلا دیں گے۔ (جیسے جھگڑا لیگ اور کانگرس کا تھا لیکن مسجد اور لائبریری ڈھاکہ میں ہماری جماعت کی جلا دی گئی حالانکہ نہ ہم لڑے اور نہ ہم بدامنی پیدا کرنا جائز سمجھتے ہیں مگر وہاں کے ہندوؤں نے ہماری مسجد اور ہماری

لائبریری کو جلا کر یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے بڑا تیر مارا ہے اور یہ خیال کر لیا کہ انہوں نے مسلمانوں سے بدلہ لے لیا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ جب اس قسم کے اختلاف پیدا ہو جائیں تو انسانی عقل ماری جاتی ہے۔ اور سیاہ اور سفید میں فرق کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے)۔ غرض گاندھی جی پر مَیں نے یہ بات واضح کی اور انہیں کہا کہ آپ کو اس بارہ میں کچھ کرنا چاہئے اور صلح کی کوشش کرنی چاہئے۔ گاندھی جی نے اس کا جو جواب دیا وہ یہ تھا کہ یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں مَیں نہیں کر سکتا۔ مَیں تو صرف گاندھی ہوں یعنی مَیں تو صرف ایک فرد ہوں اور آپ ایک جماعت کے لیڈر ہیں۔ مَیں نے کہا مَیں تو صرف پانچ سات لاکھ کا لیڈر ہوں اور ہندوستان میں پانچ سات لاکھ آدمی کیا کر سکتا ہے مگر انہوں نے اصرار کیا اور کہا کہ جو کچھ کر سکتے ہیں آپ ہی کر سکتے ہیں مَیں نہیں کر سکتا۔ جب مَیں نے دیکھا کہ گاندھی جی اس طرف نہیں آتے تو مَیں نے اس بات کو چھوڑ دیا اور پھر مَیں انہیں دوسری نصیحتیں کرتا رہا جن کی خدا نے مجھے اس وقت توفیق عطا فرمائی۔ مَیں اس موقع پر صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بعض دفعہ ایک چھوٹی سی بات ہوتی ہے مگر وہ خدا تعالیٰ کے ہاں قبول ہو جاتی ہے۔ جب رسول کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے بعد عرب اور ایران میں لڑائی چِھڑی تو اس وقت ایران کے بادشاہ نے اپنے بعض رؤساء سے کہا کہ عرب ایک چھوٹا سا غیر آباد جزیرہ ہے اور وہاں کے باشندے متفرق اقوام میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کس طرح ہمارے ملک پر حملہ کر کے چڑھ آئے ہیں؟ لوگوں نے کہا اُس قوم میں نئی بیداری پیدا ہوئی ہے اور اس وجہ سے اس میں جوش پایا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ ان لوگوں کو کچھ دے دلا کر واپس کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے اسلامی جرنیل کو لکھا کہ تم ایک وفد ہمارے پاس بھیج دو، ہم اس سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے رسول کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے ایک صحابی اور بعض دوسرے آدمیوں پر مشتمل ایک وفد بنا کر شاہِ ایران کے دربار میں بھجوا دیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا کہ تم نے یہ کیا شورش برپا کر رکھی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کچھ روپیہ لے لو اور واپس چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم روپیہ لے کر واپس چلے جائیں۔ اس کی حماقت دیکھو جو قوم اس کے ملک پر چڑھ کر آئی تھی اس قوم کے متعلق اس نے یہ فیصلہ کیا کہ دو دو اشرفیاں سپاہیوں کو اور دس دس اشرفیاں افسروں کو دے کر رخصت کر دیا جائے۔

گویا لالچ بھی دی تو اتنی چھوٹی اور حقیر کہ چُوہڑے بھی اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیا لغو بات ہے کہ تم نے خود لڑائی چھیڑی ہے ہم نے نہیں چھیڑی۔ اب اس کا فیصلہ میدان میں ہی ہو گا اور ہم جانتے ہیں کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے کیونکہ ہمارے ساتھ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ بادشاہ کو غصہ آیا اور اس نے ایک شخص سے کہا۔ ایک تھیلی میں مٹی بھر کر لاؤ۔ جب وہ مٹی بھر کر لایا تو اس نے اسے حکم دیا کہ یہ مٹی کا بورا اس مسلمان افسر کے سر پر رکھ دو۔ اس صحابیؓ نے جب یہ دیکھا تو اس نے نہایت خاموشی سے اپنا سر جھکایا اور مٹی کا بورا اپنے سر پر اٹھالیا۔ بادشاہ نے اسے کہا اب جاؤ اس کے سوا تمہیں اَور کچھ نہیں مل سکتا۔ گویا جیسے پنجابی میں کہتے ہیں کھیہہ کھاؤ۔ اردو میں یوں کہہ لو کہ تمہارے سر پر خاک۔ ویسا ہی اس بادشاہ نے کیا اور مٹی کا بورا مسلمان افسر کے سر پر لادتے ہوئے کہا۔ جاؤ اس کے سوا تمہیں اور کچھ نہیں مل سکتا۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ مومن کو بھی اپنے فضل سے ایک نور اور روشنی بخش دیتا ہے۔ جب اس نے مٹی کا بورا مسلمان افسر کے سر پر رکھوایا تو انہوں نے فوراً اس کو نیک تفاؤل پر محمول کرتے ہوئے اٹھالیا اور اپنے ساتھیوں کو یہ کہتے ہوئے دربار سے نکل بھاگے کہ آجاؤ ایران کے بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے ایران کی زمین ہمیں سونپ دی ہے۔ مشرک بزدل بھی بڑا ہوتا ہے۔ جب انہوں نے بلند آواز سے یہ فقرہ کہا تو اس نے گھبرا کر اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ انہوں نے کہا اس نے کہا ہے۔ کسریٰ نے ایران کی زمین خود اپنے ہاتھ سے ہمارے سپرد کر دی ہے۔ یہ سن کر بادشاہ گھبرا گیا اور اس نے کہا جلدی جاؤ اور اس شخص کو پکڑ کر حاضر کرو مگر اتنے میں مسلمان گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں کے کہیں جا چکے تھے۔1 گاندھی جی نے بھی کہا کہ مَیں تو کچھ نہیں کر سکتا جو کچھ کر سکتے ہیں آپ ہی کر سکتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے ایسا ہی کر دیا اور میرے وہاں ہونے کی وجہ سے ہی جھگڑے کا تصفیہ ہوا۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تصفیہ مَیں نے کیا۔ گو ہم برابر کوشش کر رہے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ پہلے چار پانچ دفعہ صلح کی کوشش ہو چکی تھی۔ گورنمنٹ نے بھی زور لگایا مگر اس معاملہ کا کوئی تصفیہ نہ ہوا۔ آخر میرے وہاں ہونے اور دعائیں کرنے سے نہ معلوم کونسے دلوں کی کنجیاں کھول دی گئیں کہ میرے وہاں جانے سے وہ کام جو پہلے بار بار کی کوششوں کے باوجود نہیں ہوا

تھا ہو گیا اور گاندھی جی کا یہ فقرہ درست ثابت ہوا کہ مَیں تو یہ کام نہیں کر سکتا آپ ہی کر سکتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس نقطہ پر لڑائی تھی گاندھی جی نے اسے تسلیم کر لیا تھا اور بالکل ممکن تھا کہ گاندھی جی کی بات مانی جاتی تو آپس میں صلح ہو جاتی۔ چنانچہ جب گاندھی جی سے نواب صاحب بھوپال نے ملاقات کی اور یہ فارمولا پیش کیا کہ لیگ کو مسلمانوں کا نمائندہ سمجھا جائے گا تو گاندھی جی نے اس کو تسلیم کر لیا اور اس پر دستخط بھی کر دیئے۔ لیکن جب دستخط ہو چکے تو پنڈت نہرو صاحب نے کہہ دیا کہ ہم گاندھی جی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس طرح وہ بات جو گاندھی جی نے کہی تھی پوری ہو گئی کہ مَیں تو صرف گاندھی ہوں میری بات کون مانتا ہے۔ چنانچہ پنڈٹ نہرو صاحب نے یہی کہا کہ اس معاملہ میں گاندھی جی سے ہمارا کیا تعلق یہ گاندھی جی کا اپنا فیصلہ ہے ہمارا فیصلہ نہیں۔ میرے نزدیک گاندھی جی نے محض بات کو ٹلانے کی کوشش کی تھی اور ان کا مطلب یہ تھا کہ مَیں اس تحریک میں حصہ لینا ضروری نہیں سمجھتا۔ حالانکہ مَیں وہاں محض ہندوؤں اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے لئے گیا تھا۔ ورنہ وزارتوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ہم دو تین ضلعوں میں اکٹھے ہوں تو یقیناً ہم اپنے نمائندے زور سے بھیج سکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے دسویں حصہ کے برابر بھی اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ پس مَیں وہاں اپنے لئے نہیں گیا تھا بلکہ اس لئے گیا تھا کہ وہ ہزاروں ہزار ہندو جو مختلف علاقوں میں مارا جا رہا ہے اُن کی جان بچ جائے۔ وہ ہزاروں ہزار مسلمان جو مختلف علاقوں میں مارا جا رہا ہے اُن کی جان بچ جائے۔ نہ وہ میرے رشتہ دار ہیں، نہ واقف ہیں، نہ دوست ہیں۔ کوئی بھی تو ان کا میرے ساتھ تعلق نہیں۔ سوائے اس تعلق کے کہ میرے پیدا کرنے والے خدا نے ان کو بھی پیدا کیا ہے اور میرا فرض ہے کہ مَیں ان کی جانوں کی حفاظت کروں۔ صرف اس دکھ اور درد کی وجہ سے مَیں وہاں گیا اور صرف اس دکھ اور درد کی وجہ سے مَیں نے ان کوششوں میں حصہ لیا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ گاندھی جی نے میرے اخلاص کی قدر نہ کی اور اُنہوں نے کہہ دیا کہ میری بات کون مانتا ہے۔ مَیں تو صرف گاندھی ہوں۔ انہوں نے یہ فقرہ محض ٹالنے کے لئے کہا تھا مگر خدا تعالیٰ نے واقع میں ایسا کر دکھایا اور پنڈت نہرو صاحب نے

گفتگو کرنے والوں سے صاف کہہ دیا کہ یہ ہمارا فیصلہ نہیں۔ گاندھی جی کا فیصلہ ہے اور ہم گاندھی جی کا یہ فیصلہ ماننے کو تیار نہیں۔ جب حالات یہ رنگ اختیار کر گئے تو مسٹر جناح نے نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے کام لیتے ہوئے وائسرائے کو لکھ دیا کہ کانگرس سے تو ہمارا فیصلہ نہیں ہو سکا لیکن ہم آپ کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے حکومت میں شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح کام بھی ہو گیا اور بات بھی بن گئی اور مسٹر گاندھی اس معاملہ میں خالی گاندھی بن کے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ہماری غرض بھی پوری کر دی۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے ہمارا دہلی سے جمعہ کو چلنے کا ارادہ تھا اور ہم سیٹیں بھی بُک کرا چکے تھے مگر بدھ کے دن ہمیں معلوم ہوا کہ مصالحت کی گفتگو میں خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ چونکہ ہمارے تعلقات تمام لوگوں کے ساتھ تھے اس لئے قبل از وقت ہمیں حالات کا علم ہو جاتا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ کام بگڑ رہا ہے تو مَیں نے پھر دوستوں کو بلایا اور ان سے مشورہ لیا اور انہیں کہا کہ ہم اِتنی مدت یہاں رہے ہیں۔ اب ہمیں پیر تک اَور ٹھہر جانا چاہئے۔ پہلے تو اتوار تک ٹھہرنے کا ارادہ تھا لیکن معلوم ہوا کہ اتوار کو گاڑی ریزرو نہیں ہو سکتی اِس لئے ہم نے پیر کے دن چلنے کا فیصلہ کیا اور عین پیر کے دن صبح کے وقت فیصلہ ہو گیا اور ہم خدا تعالیٰ کے فضل سے اِس جھگڑے کو نپٹا کر اپنے گھر واپس آئے۔

اس سفر میں یہ ایک نہایت ہی خوشی کی بات مجھے معلوم ہوئی ہے کہ وہ مسلمان جو اپنے تفرقہ اور نکمّا پن کی وجہ سے مشہور ہیں اُن میں بھی اب اخلاص اور بیداری پیدا ہو چکی ہے اور وہ اپنے فرائض کو سمجھنے لگ گئے ہیں۔ چنانچہ نواب صاحب چھتاری، سر آغا خاں اور سر سلطان احمد نے نہایت بے نفسی کے ساتھ اس موقع پر کام کیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں اگر ان کی بے نفسی اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا حال پبلک کو معلوم ہو جائے تو وہ ان کی قدر کئے بغیر نہ رہے۔ پھر سب سے زیادہ کام نواب صاحب بھوپال نے کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلامی تعلیم کی رو سے سب انسان برابر ہیں، کوئی چھوٹا بڑا نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کی دیر سے عزتیں قائم ہو چکی ہیں وہ معمولی کام کرنے سے بھی گھبراتے ہیں لیکن نواب صاحب نے باوجود ایک مقتدر ریاست کا نواب ہونے کے جو ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی ان کو کرنا پڑا انہوں نے کیا۔ یہاں تک کہ منتیں بھی کیں۔ وہ گاندھی جی کے پاس گئے اور بھنگی کالونی میں ان سے ملاقات کی۔ پہلی ملاقات

بے شک بڑودہ ہاؤس میں ہوئی تھی اور نواب صاحب کے مشیر نے کہا تھا کہ ہم یہ پسند نہیں کرسکتے کہ نواب صاحب بھنگی کالونی میں جائیں لیکن بعد میں انہوں نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ صرف بڑودہ ہاؤس میں ملاقات ہو بلکہ خود ان کے گھروں پر گئے اور رات اور دن کوشش کی کہ کسی طرح صلح ہو جائے۔ یہ علامت ہے اِس بات کی کہ اب مسلمانوں میں بھی قربانی اور بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ خواہ دنیا کی نگاہ سے نواب صاحب بھوپال، نواب صاحب چھتاری، سر سلطان احمد اور سر آغا خاں کی قربانی او جھل رہے مگر اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اور تمام رازوں کو جاننے والا ہے اُس نے یقیناً ان لوگوں کے ایثار اور ان کی قربانی کو دیکھا ہے اور خدا کی درگاہ سے یہ لوگ بدلہ لئے بغیر نہیں رہیں گے کیونکہ خدا کسی کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ مضمون تو اَور بھی بیان کرنا تھا مگر چونکہ وقت زیادہ ہو گیا ہے اس لئے اسی پر ختم کرتا ہوں۔"

(الفضل 13 نومبر 1946ء)

1: طبری جلد 4 صفحہ 322 تا 325۔ مطبوعہ بیروت 1987ء